© rasailojaraid.com

جوابِ تنقید

از جناب قدیرالدین صاحب سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ

(فروری اور مئی ۱۹۵۸ء کے ترجمان القرآن میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے اشارات میں جناب قدیرالدین صاحب کے ایک مضمون پر تنقید کی تھی۔ اس پر یہ جوابِ تنقید صاحب موصوف کی طرف سے وصول ہوا ہے۔ ان کے حقِ جواب کا اعتراف کرتے ہوئے یہ مضمون یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ مگر آئندہ کے لیے اس بحث کو ختم سمجھا جائے)

"اپنے رب کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ اور لوگوں سے مباحثہ بہترین طریقہ سے کرو"

(قرآن۔ النحل ۱۶: ۱۲۵)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس آیت کریمہ کی تفسیر تفہیم القرآن میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

"حکمت کا مطلب یہ ہے کہ..... حالات کو سمجھ کر اور موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے ......
ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے...... اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں"۔

یہ تمہید میں نے اس وجہ سے کی ہے کہ میں نے ایک مقالہ "قرآنی نظریۂ ریاست" پر یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں۔ اس کی پانچ سو کاپیاں معارف لمیٹڈ پریس کے ایک حصہ دار نے اپنے خرچ پر چھپوائیں۔ اُن میں سے ڈھائی سو کاپیاں لاہور اور کراچی میں تقسیم ہوئیں اور باقی ابھی موجود ہیں۔ اُس مقالہ کی بنا پر میرا نام پہلی مرتبہ ترجمان القرآن جیسے مقتدر ماہنامہ میں آیا۔ مگر آیا تو اس طرح کہ چھوٹتے ہی عبدالحمید صدیقی صاحب ایڈیٹر ماہنامۂ مذکور نے میری نیت پر حملہ کر دیا۔ پہلے ہی پیراگراف میں ارشاد ہوا کہ:۔

"یہ مقالہ اعلیٰ طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور اُسے بعض روایات کے مطابق انتہائی سرگرمی کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت پھیلایا جا رہا ہے"۔

کیا روایات؟ کس کی روایات؟ کونسا مقصد؟ کہاں پھیلایا جا رہا ہے؟ اگر کھول کر بیان کر دیتے تو پڑھنے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی کچھ اپنی رائے قائم کرسکتے اور مجھے بھی معلوم ہو جاتا کہ صدیقی صاحب کس گھر سے راز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بس طباعتی معیار کا ذکر کر کے کسی خفیہ روایات پر بات کو ختم کر دیا ۔ یہ خیال نہ کیا کہ پڑھنے والے تو بد سے بد تر مقصد تصور کرلیں گے، ایسا گندہ مقصد کہ منہ پر لانے کے قابل نہیں ۔ حالانکہ اس بدظنی کی کوئی اصلیت نہیں اور اس بے بنیاد تہمت کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نام نامی بھی شامل ہے کیونکہ ہر پرچہ پر درج ہے ۔ "مرتبہ ابوالاعلیٰ مودودی"۔

حیرت یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے نہ سنجیدگی کو پسند فرمایا اور نہ پروفیسرانہ احتیاط کو ملحوظ رکھا بس اختلاف ہوا تو ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا ہے کہ:

"(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

آل عمران ۱۵۹ (تفہیم القرآن)

اگر مقصد تبلیغِ دین تھا تو اللہ کے اس حکم کا خیال ضرور کرتے ۔ البتہ اگر غرض تکرار ہے تو اس زحمت کی ضرورت نہ تھی ۔ صدیقی صاحب نے بیشک میرے لیے کوئی فحش لفظ تو استعمال نہیں کیا ۔ مگر اس حد کے اندر رہ کر خوب خوب دشنام دہی سے کام لیا ہے ۔ میں اُس سب سے قطع نظر کرتا ہوں ۔ "بدم گفتی و خورسندم" کیونکہ میں خدا کی رحمت سے اور رسول اکرمؐ کی ہدایت سے مایوس نہ اپنے لیے ہوں اور نہ اُن کے لیے ۔ میرا مقصد اسلام پر اعتراض نہیں مسلمانوں کے رہبروں کی توجہ حاصل کرنا ہے ۔

صدیقی صاحب کو میرا مقصد معلوم کرنے کے لیے روایات میں "کھوئے" جانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں خود عرض کر دوں کہ اگر میرے مقالے کی طباعت کا معیار بلند نہ ہوتا تو غالباً صدیقی صاحب توجہ نہ فرماتے، کیونکہ سب سے زیادہ جس چیز نے اُنہیں متاثر کیا وہ یہی معیار تھا ۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اہل درد اور صاحب علم مسلمانوں کو بتاؤں کہ لوگ بھٹک رہے ہیں لیکن ان کی رہبری نہیں کی جا رہی ۔ حکومت کے سامنے جو مسئلے درپیش ہیں ان کا حل نکالنا اور اس کو عملی صورت سے پیش کرنا اشد ضروری کام ہے ۔ یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ایسی چالیس حکومتوں کے اہل اقتدار کو، جن کا دائرہ آدھی دنیا کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ:۔

" دشواریوں کا تذکرہ بعد کی باتیں ہیں ۔ ایسے دانشوروں کو جنہیں اس بات پر شرح صدر حاصل نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر کافرانہ نظام کو ہٹا کر اسلامی نظام کر دیا جائے تو اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہو سکیں گے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایمان تو نام ہی اِس یقین کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اسلام کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانیت کو جو ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہی انسانی مسائل کا صحیح حل اور انسانیت کے دکھوں کا حقیقی مداوا ہے۔ جن دانشوروں کو اس حقیقت میں شک ہے انہیں اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلقِ خاطر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ایک مومن کی سب سے بڑی نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی حکم سنتا ہے تو اس کے سامنے فوراً سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے"۔

بس یہ سارے مسائل کا حل ہے جو صدیقی صاحب نے بتا دیا۔ یہ نہ سوچا اور نہ پوچھا کہ وہ مسائل ہیں کیا؟ لاؤ ہم حل کر کے بتا دیں۔ یہ نہیں کہ کوئی سوال نہیں پوچھے۔ سوال تو اُٹھائے۔ مگر ایسے کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ خیال آیا ہی نہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔ صدیقی صاحب نے فرمایا کہ "دشواریوں کا تذکرہ بعد کی باتیں ہیں" اور یہ کہ "اسلامی نظام قائم کر دیا جائے تو اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہو سکیں گے"۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ کس طرح؟ تو وہ اپنے ایمان کی خبر لے۔ اسی لیے تو میں نے عرض کیا تھا اور خود صدیقی صاحب نے اس کو فروری کے پرچہ کے صفحہ ۴۴۲ پر نقل بھی کیا ہے کہ:۔

"یہ لوگ (مسلمانوں کی چالیس حکومتوں کے اہلِ اقتدار) عملی انسان ہیں جنہیں مسائل کا سامنا کر کے ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ وہ اپنے موجودہ طرزِ عمل کو اس وقت تک ترک نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر وہ (مبلغین کے) (نوٹ اسلام نہیں۔ یہاں ترجمہ میں غلطی ہوئی ہے۔ سارا پیرہ اہلِ علم کے متعلق ہے) تابع فرمان بن جائیں تو اجتماعی معاملات بخوبی طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر ہم ان حضرات (اہلِ اقتدار) کو قائل یا ان کے اندازِ فکر کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں تو اُن کمزور افراد کی تائید و حمایت سے کیا فائدہ جو نہ تو معاملات کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور نہ قوم کی سربراہی کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ ہماری قیمتی عددی قوت تو ہیں مگر یہ اہم مسائل کو منفی انداز میں حل کرنے کے عادی ہیں۔ اور ہمیں تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت ہے۔ یعنی اختصاصی علم اور دنیوی معاملات کا تجربہ"۔

اب فرمائیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ غلط تھا یا صحیح؟ میں نے جو کہا تھا وہ صدیقی صاحب نے کر کے دکھایا؟ اُن کو نہ تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت کا خیال آیا، نہ اختصاصی علم کی حاجت کا، اور نہ دُنیا کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجربہ کا۔ اس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مندرجہ بالا تحریر کی بابت ارشاد کیا کہ (فروری صفحہ ۲۴۴):-

"ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں نہ صرف ہمارا اخلاق بگڑا ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کا معیار بھی کافی حد تک پست ہوا ہے۔ ملک کے ایک نامور صاحب علم لادینیت کے حق میں اس طرح کی بھونڈی دلیلیں پیش کر کے اپنے موقف کی صحت تسلیم کروانے پر مُصر نظر آتے ہیں۔ اگر ہم فاضل مقالہ نگار کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ کسی چیز کا موجود ہونا ہی اس کے برحق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور کسی چیز کی غیر موجودگی اس کے ناممکن العمل ہونے کی زبردست شہادت تو اس سے تو دنیا میں خیر اور بھلائی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

صدیقی صاحب کے سوچنے سمجھنے کا جو معیار ہے وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہے۔ میری مندرجہ بالا عبارت کو پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں لادینیت کہاں ہے؟ اگر اہل اقتدار بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ لادینیت ہو گئی؟ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی ان کو مطمئن نہیں کرتا تو یہ لادینیت کی طرف داری ہو گئی؟ اور بھونڈی دلیلیں ہو گئیں؟ بلکہ سمجھ کا پست معیار ہو گیا؟ صدیقی صاحب کے نزدیک ان کی ترش کلامی جائز ہے، کیونکہ وہ پہلے ہی مرض کی تشخیص کر چکے کہ یہ سب لوگ پہلے اپنے ایمان کی خبر لیں۔ اور اب گفتگو بے ایمانوں سے ہو رہی ہے۔ اب اس کی حاجت ہی نہیں کہ ہدایت کے وہ قطرے ٹپکائیں جن سے "جگر لالہ میں ٹھنڈک" پہنچے۔ اب تو وہ کڑک اور بجلی کا طوفان بنے ہوئے ہیں۔ سارے دانشور اب دشمنوں کی صف میں ہیں۔ وہ سب کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح دین کی تبلیغ کی اور خدائے بزرگ و برتر نے اسی طریقہ ہدایت کا حکم فرمایا ہے؟ میں دو آیات کریمہ تو اوپر پیش کر چکا ہوں۔ اب وہ جانیں اور ان کا بے لگام قلم۔ میں تو پھر بھی یہ کہتا ہوں کہ اس میں صدیقی صاحب مجبور ہیں کیونکہ کام مشکل ہے اور ایسے وقت بحث میں خدا اور اس کے رسولؐ کو بطور ڈھال کے استعمال کرنا آسان کام ہے۔ انہوں نے اس کام کو اور آسان اس طرح بنا لیا کہ مشکلات کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مشکلات درپیش ہیں۔ جو مشکلات راستہ میں حائل ہیں ان کی نشاندہی تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب خود ۱۹۴۸ء میں اُن تقریروں کے دوران فرما چکے ہیں جو انہوں نے لاء کالج لاہور میں کی تھیں۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور قدیم طرز تعلیم کی پیداوار دونوں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ صدیقی صاحب نے میرے طرز استدلال کو تو "بالکل وہی" بنایا ہے جو "غیر مسلم مستشرقین اور مسلمان مستغربین" اختیار کرتے ہیں (صفحہ ۲۴۳)،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے ایسے لوگوں کا ذکر تو بیکار ہے۔ اُن اصحاب کے متعلق مولانا صاحب کے ارشادات سُنیے جو گمراہوں کی راہبری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"پہلے مدت ہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشو و نما معطل رہا۔ (نوٹ، اس وقت نہ وہ مستشرقین تھے اور نہ وہ مستغربین جن کو صدیقی صاحب ہر بُرائی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں)۔ پھر جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا۔ اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہِ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کچھ کم نہ تھی کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و رُوح کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اُٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اُٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ مذہبی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔ اُن کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آ رہا تھا۔" (تقریر مورخہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء)

یہ حالت قدیم زمانے کی نہیں بلکہ بموجب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب آج بھی یہی کیفیت ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب اُسی تقریر میں فرماتے ہیں کہ:۔

"حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اِس وقت تک بیسویں صدی کے لیے بارھویں صدی کے مردانِ کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لیے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا سکے اور چلا سکے۔"

علمائے دیوبند و بریلی اِس سے اتفاق نہیں کریں گے۔ مگر اِن الفاظ میں مولانا صاحب نے "مغرب زدہ" طبقے کو معاف فرما کر ذمہ داری ان پر رکھی ہے جن کو صدیقی صاحب نے "رجعت پسند" (فروری ص ۲۸۵) کا خطاب دیا ہے۔ جدید طرز کے خیالات والوں کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اصل مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ (جدید تعلیم یافتہ حضرات کا) جن کی فکر و محنت اس کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درکار ہے۔ (نوٹ - مولانا صاحب کو اِس ضرورت کا احساس ہے) بجائے خود مطمئن نہیں ہیں - اور ان کے عدمِ اطمینان کی وجہ ان کی عدم واقفیت ہے - اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے"۔

(تقریر مورخہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء)

اب اگر میں نے اہل علم کی توجہ اس طرف دلانی چاہی تو کم از کم صدیقی صاحب تو ٹھنڈے دل سے غور فرماتے۔ مگر وہ اس کو "چوٹ" (صفحہ ۲۰۵) فرماتے ہیں - اور اپنی طرف سے اس پر نمک مرچ چھڑک کر اس کی کسک کو پڑھنے والوں تک پہنچا دینا چاہتے ہیں - وہ تو الزام تراشیاں کر کے اپنا حق ادا کر چکے -

کیا قرآن پاک میں وسعت نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا یہ خطرناک چیز ہے؟

صدیقی صاحب فروری کی اشاعت کے صفحہ نمبر ۲۴۳ پر فرماتے ہیں کہ :-

"صاحبِ مقالہ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہمیں یہ مژدۂ جانفزا بھی سُنا دیا کہ شامِ ہمدرد کی محفلیں سجانے والے حکیم محمد سعید صاحب اس طرح کے دیگر عنوانات کے تحت ذی علم حضرات کو مقالات پیش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں جن میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ جو بات بھی کہی جائے وہ "خالص قرآنی نقطۂ نظر" سے کی جائے - ہم اس فاضلانہ مقالے کے مندرجات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلم قوم کے اندر یہ رجحان ہی بڑا خطرناک ہے کہ اس کے اہلِ علم سنّت سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن کی روشنی میں اپنے مسائل حل کریں"۔

حالانکہ یہ مسئلہ نہ حکیم محمد سعید صاحب نے چھیڑا تھا اور نہ میں نے کہ قرآنِ پاک لے لو اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو - بس قرآن پاک کا نام لینا ہی خطرہ کا نشان بن گیا اور اس کو ایک سازش تصوّر کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے - چنانچہ مئی کی اشاعت میں صفحہ ۳۰۱ پر صدیقی صاحب یوں رقمطراز ہیں کہ :-

"اہلِ مغرب نے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے علمی سطح پر جو سازشیں کی ہیں اُن میں سے ایک نہایت ہی خطرناک سازش یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات اور دینی تصورات میں بظاہر اتنی وسعت پیدا کر دی جائے جس سے اسلام کی ہمہ گیری میں اضافہ ہو اور جس میں انسان کھو کر دینِ حق سے لاشعوری طور پر دُور ہوتا چلا جائے"۔

مذکورہ بالا پرچے کے صفحہ ۱۱ پر منکرین سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ وہ لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا پیغام ابدی اور آفاقی ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت کو پورا کرنے کے لیے "جو ادارے جس انداز اور صورت میں" قائم کیے، ان پر چونکہ وقت کی چھاپ تھی" اس لیے وہ اسلام کے سرمدی پیغام کے ترجمان نہیں ہو سکتے"۔

منکرین سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا ہو وہ جانیں۔ مگر حکیم محمد سعید صاحب نے اور میں نے تو سنتِ رسول اللہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس لیے یہ الزام ہم پر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ کیا قرآن پاک کا پیغام ابدی، آفاقی، سرمدی اور ہمہ گیر نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کیا "خالص" قرآن کے نقطۂ نظر کا مطالعہ واقعی خطرناک ہے؟ اور کلام پاک کی طرف توجہ کرنا ایک سازش ہے؟

میرا تو یہ ایمان ہے کہ کلام اللہ ابدی، آفاقی، سرمدی اور ہمہ گیر پیغام ہے جو زمان و مکان سے ماوراء ہر زمانے، ہر قوم و ملت اور ہر سرزمین کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ تو اسلام کی خوبی اور کلام اللہ کی بڑی اعلیٰ صفات ہیں۔ کلامِ پاک اور اس کے تصورات میں اتنی وسعت ہے کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کی جا سکتی اور کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا کہ اس کی وسعت میں اضافہ کر سکے، اہل مغرب کی کیا مجال ہے۔ اس کے برعکس کلام اللہ کی آفاقیت، ابدیت اور سرمدیت سے ڈرنا اور ان صفات کو سازش کہنا اس کی توقیر اور اعلیٰ مرتبت کا اقرار نہیں ہے۔ اسلام انسان کی تاریخ کے ارتقاء کا جو تصور دیتا ہے، ساری کائنات کے ایک قانون کے ماتحت ہونے کا جو راز بتاتا ہے، اس دنیا کے لیے بلکہ جہانوں کے لیے رحمت ہونے کا جو وعدہ کرتا ہے، آفاقی انصاف کا جو نظریہ دیتا ہے، جس طرح سزا اور جزا کو اعمال کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے، دنیا کو دین سے اور بندے کو براہ راست خدا سے ملاتا ہے، تنگ نظری کو برا کہتا ہے، ان خوبیوں کو بگاڑنے کے لیے سازش کی ضرورت ہے نہ کہ ان کو ماننے اور جاننے کے لیے۔

صدیقی صاحب کو ڈر یہ ہے کہ اگر انسان نے اسلام کی ہمہ گیری جان لی تو "لاشعوری طور پر دین برحق سے دور" ہو جائے گا۔ کون سے دین سے؟ اسی دین سے جو آفاقی، ابدی، سرمدی اور ہمہ گیر ہے؟ اس سے تو وہ قریب تر ہو گا۔ البتہ فرقہ بندیوں اور روز کی تکرار سے دور ہو جائے گا۔ جس طرح خیال نے یہ خیال کیا ہے کہ صحیح بخاری، جس کو آج کلامِ پاک کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب کہتے ہیں، اس کے مرتب امام بخاریؒ کی زندگی میں ان کو اتنا تنگ کیا گیا کہ انہوں نے مرنے کی آرزو کی۔ آج امام ابو حنیفہؒ کے فتووں کو اعتقادات کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ اگر اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری کو جانتے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماننے تو مولانا حالیؒ، مولانا شبلیؒ، ڈاکٹر اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر کفر کے فتوے نہ لگتے۔ دلوں میں اختلاف کی سمائی ہوئی اتنی وسعت ہوتی کہ دوسروں کی نیک نیتی کو تسلیم کریں۔ بس کسی کی ایک آدھ بات اپنے خیال کے خلاف ملی اور اس کی عزت کو مٹا دینے کے درپے ہو گئے اور کافر بنا کر کافر گر خوش ہوئے کہ ہماری پارٹی کی فتح ہو گئی۔ اگر ہم خیال بنا کر مسلمان نہ کیا تو کیا ہوا۔ کافر تو بنا کر چھوڑا۔ جو داغ ہم نے لگایا ہے اس کی بُو آنے والی نسلوں کی ناک میں تو جائے گی۔ اُدھر یہ ہوا کہ لفظ کفر سے نفرت کی بُو دُور ہوتی چلی گئی۔ اور لاکھوں مسلمانوں نے اُن ہیؒ کا فردوں "کی عزت بھی کی اور ان کو مظلوم بھی جانا۔ اب ان اختلافات کا فیصلہ روزِ حساب میں اللہ کے سامنے ہوگا۔ کیونکہ ایسے اختلافات کا فیصلہ اس نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ (المائدہ ۵: ۴۸)

اہلِ اسلام کو فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا آسان ہے۔ کیونکہ اس میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی کے جذبات کو تسکین ہوتی ہے۔ اور یہ بھی آسان ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت حق پر ہونے کی دعویدار بن جائے اور اس زعم پر مطمئن رہے کہ وہی اکیلا حق پر ہے۔ اس حالت میں کلام پاک کی اِن آیات کریمہ کو یاد رکھنا چاہیے کہ:

"(پس اے نبیؐ اور نبی کے پیرو) یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے اور نماز قائم کرو۔ اور نہ ہو جاؤ ان مشرکوں میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے۔ اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ مگن ہے۔ (روم ۳۰: ۳۰ تا ۳۲) تفہیم القرآن۔

یہ حکم بموجب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نبی کے لیے بھی تھا اور ان کے پیروؤں کے لیے بھی ہے۔ ذرا 'فطرت' کے لفظ پر غور کیجیے، ساخت کی ابدیت پر غور کیجیے۔ اس پر بھی غور کیجیے کہ دین کو بانٹنے والوں کی مثال مشرکوں سے دی گئی ہے۔ اور اس پر غور کیجیے کہ ہر ایک گروہ یہ سمجھ کر مگن رہتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہ اعلان قرآن پاک کی ہمہ گیری، آفاقیت، سرمدیت اور ابدیت نہیں تو اور کیا ہے؟

شاید صدیقی صاحب کو یہ ڈر بھی ہے کہ اگر اِن اعلیٰ اوصاف کا اظہار کیا گیا تو لوگ سنتِ رسولؐ اللہ کو چھوڑ دیں گے، کیونکہ منکرینِ سنت یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی ساری حیاتِ طیبہ پر زمان و مکان کی چھاپ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر اس خیال سے تو وہ لوگ ڈریں جن کو یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیا رسولِ برحق اور محبوب خدا کی زندگی قرآنی زندگی نہ تھی؟ اگر ہم یہ مانتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور تقاریر کی ابدیت ظاہر کریں جیسے کہ وہ درحقیقت ہیں۔ اس خیال کا جواب یہ تو نہیں ہے کہ قرآن پاک اور اسلام کی ابدیت، آفاقیت، ہمہ گیری اور سرمدیت سے کر اس کو سازش کہیں اور اس کو چھپانے ٹپانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ یہ باتیں چھپانے سے چھپتی ہیں؟ یا اس کاٹ چھانٹ سے فنا ہوتی ہے؟

ممکن ہے صدیقی صاحب اس سے ڈرتے ہوں کہ سب لوگ کلام پاک پڑھیں گے تو معلوم نہیں کیا سمجھ بیٹھیں۔ یہ ڈر عیسائیوں کے روم کے پاپائے اعظم کو بھی لاحق ہے۔ انہوں نے بھی صدیوں انجیل کے مطالعہ سے منع فرمایا تھا۔ کیونکہ وہ بھی یہ ڈرتے رہے ہیں کہ کہیں میرے پیرو وہ بات نہ پڑھ لیں جس کو میں نہیں مانتا۔ صحیح بات تو بس وہی ہے جو میں کہہ دوں۔ مگر اسلام میں تو کوئی اس طرح کے پاپائے اعظم موجود نہیں ہیں۔ یہاں یہ ڈر کیوں لاحق ہو؟ یہاں تو کام افہام و تفہیم، خلوص اور دین کی محبت سے چلتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کلامِ پاک کو سمجھنے کے لیے علم دین چاہیے۔ مگر ہاں دنیا کی خبر بھی ہونی چاہیے، جو اس کے مسائل ہیں ان کا بھی علم اور تجربہ ہونا چاہیے۔ جتنی خبر ان باتوں کی ہوگی اتنی ہی قدر بنیادی اصولوں کی ہوگی۔ کیونکہ بنیادی اصول سب جزویات پر حاوی ہوتے ہیں۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقاریر سے اصول نکالنے میں آسانی ہوگی۔

(باقی)

(بقیہ اتمامِ نعمت)

اس حدیث میں اس بات کا قطعی ثبوت موجود ہے کہ شریعت نے ہر طریقۂ عمل کی وضاحت کر دی ہے۔ اب بنی نوع انسان کے لیے دو ہی ممکن راستے ہیں یا تو وہ طریقہ اختیار کریں جو شریعت نے بتلایا ہے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے طریقے پر عمل پیرا ہوں۔ لیکن دوسری صورت میں یہ ضرور لازم آئے گا کہ انہوں نے سنت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ تصور کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی فعل اب بھی ممکن ہے جس کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہو۔

(باقی)

© rasailojaraid.com